https://telegram.me/ilmokitab

گوہرِ مخزنِ ظرافت

کنہیالال کپور

شوکت تھانوی مرحوم جب تک بقید حیات رہے عوام ان سے خوش اور نقاد نالاں رہے۔ مؤخرالذکر کو مرحوم سے طرح طرح کی شکایتیں تھیں۔ مثلاً شوکت تھانوی شوکت تھانوی کیوں ہے؟ رشید احمد صدیقی، پطرس، عظیم بیگ چغتائی یا فرحت اللہ بیگ کیوں نہیں تھے؟ شوکت تھانوی عوام میں ہر دل عزیز کیوں تھے؟ شوکت مزاح نگار ہونے کے علاوہ فلسفی کیوں نہیں تھے؟ شوکت بسیار نویس کیوں تھے؟ شوکت ایم-اے-علیگ یا بی-اے کینٹب کیوں نہیں تھے؟ بلاشک یہ سب خامیاں شوکت میں تھیں لیکن اگر خدا لگتی کہی جائے تو وہ ان میں سے کسی خامی کے لیے مطلقاً ذمہ دار نہیں تھے۔ اگر وہ شوکت تھانوی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھے۔ تو یہ امر ان کی خود اعتمادی اور دیانت داری پر دلالت کرتا ہے۔ آخر یہ کہاں کی تنقید ہے کہ مزاح نگار سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنی انفرادیت کو ترک کر کے اپنے کو دوسروں میں مدغم کر دے۔

خدا کا شکر ہے کہ قریب قریب سب نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ شوکت عوام میں حد درجہ مقبول تھے۔ وہ شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں یا دیدہ و دانستہ اس سے آنکھیں چرانا چاہتے ہیں کہ شوکت خواص میں بھی اتنے ہی ہر دل عزیز تھے۔ کیوں کہ روسا، علما اور ادبا

بھی ان کے اتنے ہی مداح تھے جتنے کہ عوام۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی ہر دل عزیزی کا خمیازہ ان کے مداحوں کو اٹھانا پڑتا تھا۔ وہ جب بھی شوکت کی تازہ تصنیف خریدتے ان کا کوئی نہ کوئی دوست اسے اٹھا کر لے جاتا۔ مجھے اس بات کا ذاتی تجربہ ہے کہ شوکت کی تصانیف دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ بسا اوقات یوں بھی ہوا کہ میری میز پر مشہور ادبا کی تازہ ترین تصانیف پڑی ہیں ان میں دو ایک کا مصنف شوکت بھی ہے۔ میرے احباب جن میں سبھی طرح کے لوگ شامل ہیں کسی اور کتاب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے لیکن شوکت کی تازہ تخلیق پر اس طرح جھپٹتے ہیں جیسے بھوکا آدمی خوانِ نعمت پر اور ان کی اس حرکت کو دیکھ کر مجھے ان پر غصہ اور شوکت پر پیار آنے لگتا ہے اور اسی وقت فوراً مجھے ایک بھولا بسرا واقعہ یاد آجاتا ہے۔

یہ شاید 1945ء کی بات ہے۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور میں کافی ہاؤس میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ ایک مشہور ناشر جو اپنی بھاری بھرکم جسامت کی وجہ سے مولوی اور پہلوان کا مرکب معلوم ہوتا تھا۔ ہماری میز کے قریب آیا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے ہم تینوں سے درخواست کی: ''ہمیں کبھی بھی خدمت کا موقع دیجیے۔''

منٹو نے طنزیہ انداز میں جواب دیا:

"بس آپ شوکت تھانوی کی کتابیں ہی چھاپا کیجیے۔'' کرشن اور میں نے منٹو کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا: "منٹو صاحب ٹھیک فرما رہے ہیں۔'' ایک لحظہ کے لیے ناشر دم بخود ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ہم تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''گستاخی معاف، ایک بات عرض کرسکتا ہوں؟''

''ہاں ہاں بڑے شوق سے۔''

''آپ اپنے کو عظیم ادیب سمجھتے ہیں اور شاید عوام کے علم بردار بھی۔ لیکن معاف کیجیے گا آپ کی تصنیفات عوام نہیں خریدتے۔ کالج کے چھوکرے اور چھوکریاں خریدتی ہیں۔ لیکن وہ تو عوام میں سے نہیں ہیں۔ ادھر شوکت تھانوی کی تخلیقات کا یہ حال ہے کہ ہم صرف اس کی نئی

کتاب کے نام کا اعلان کرتے ہیں کہ پانچ ہزار جلدیں بک ہو جاتی ہیں۔حالاں کہ آپ کی کسی کتاب کا ایڈیشن ایک ہزار سے تجاوز نہیں کرتا۔شوکت تھانوی کچھ بھی ہوں۔عوام کے ادیب ہیں۔وہ عوام کے لیے لکھتے ہیں......اچھا السلام علیکم۔"

وہ کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا اور ہم تینوں پر گویا برف گر گئی۔دل ہی دل میں ہمیں شدید خفت کا احساس ہوا۔کیوں کہ اس کی بات صداقت پر مبنی تھی۔شوکت کو عوام سے اور عوام کو شوکت سے والہانہ عشق تھا۔وہ صحیح معنوں میں عوامی ادیب تھے اور ہم جو بزعم خویش اپنے کو عوام کا حمایتی سمجھتے تھے۔ان سے اتنے ہی دور تھے جتنا کفر ایمان سے ہوتا ہے۔

شوکت کی یہی خوبی کچھ نقادوں کے نزدیک ان کی سب سے بڑی خامی ہے۔میری رائے میں عوام کے لیے لکھنا جرم ہے نہ گناہ- آج تمام اشتراکی ممالک میں عوام کے لیے لکھنا باعث فخر خیال کیا جاتا ہے۔استالین نے ایک بار ادبا سے خطاب کرتے وقت ایک یونانی دیو کی مثال دی تھی جسے کوئی شخص اس وقت تک پچھاڑ نہیں سکتا تھا جب تک اس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہتے آخر ایک پہلوان نے اسے ہوا میں اچھالا اور اس پر کاری وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔استالین نے اس کہانی سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا تھا:

"یاد رکھیے۔وہ ادیب کبھی فنا نہیں ہو سکتا جس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہیں گے۔"

شوکت تھانوی خدانخواستہ اشتراکی ادیب تو نہیں تھے لیکن انہوں نے ہمیشہ زمین سے اپنا رابطہ قائم رکھا اور یہی وجہ ہے کہ نقادوں کی کڑی تنقید کے باوجود زندہ رہے اور اپنی زندگی میں زندہ جاوید بھی ہو گئے۔

کچھ نقادوں کو شکوہ تھا کہ شوکت کی ذہنیت خام تھی۔ان کا شعور ناپختہ تھا۔وہ دوسرے یا تیسرے درجے کی چیز میں لکھا کرتے تھے۔مجھے اس رائے سے بھی اتفاق نہیں۔جو شخص اتنا کچھ لکھے چاہے وہ ٹیگور ہو، منشی پریم چند یا اقبال ہو ہمیشہ اعلیٰ پائے کے ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ٹیگور کو ہی لے لیجیے۔آپ کو اس کے کلیات میں ایسی چیزیں مل جائیں گی جنہیں پڑھ کر

آپ کا سر ندامت سے جھک جائے گا۔ خود ٹیگور نے اپنی مشہور عالم تصنیف "گیتا نجلی" کے بارے میں کہ جس پر اسے نوبل پرائز ملا لکھا ہے:

"میں یہ نظمیں رات کے وقت چھپ کر لکھا کرتا تھا۔ کیوں کہ ان میں ادبیت کا فقدان تھا۔ انہیں لکھتے وقت مجھے ہی ڈر لگا رہتا تھا کہ کسی نے آ کے دیکھ لیا تو۔"

اس میں مطلقاً شک نہیں کہ شوکت نے دوسرے یا تیسرے درجے کی چیزیں بھی لکھی ہیں۔ بعض اوقات بھلے چنگے مضامین میں فرسودہ یا عامیانہ اشعار بھی نقل کیے ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے اعلیٰ قسم کے ادب کی بھی تخلیق کی ہے۔ میرے اس دعوےٰ کے ثبوت میں "مضامین شوکت"، "شیش محل"، "بار خاطر" اور "قاعدہ بے قاعدہ" پیش کی جا سکتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے "شیش محل" پہلی بار پڑھی تو میری ملاقات ایک نئے شوکت سے ہوئی۔ ایسا شوکت جو محض ایک فقرے کے شیشے میں پری اتار سکتا تھا اور جس کے اسلوب بیان کے ایجاز و اختصار کا یہ عالم تھا کہ اس کا ایک ایک جملہ دوسروں کے پورے مضامین پر بھاری تھا۔ کوزے میں دریا کو بند کرنے کی بہتوں نے کوشش کی ہے۔ کہیں یا تو انہیں کوزہ میسر نہیں آیا یا وہ "ذرا سی آبجو" کو "بحر بے کراں" کے ساتھ خلط ملط کرتے رہے۔ اس محاورے کو عملی جامہ پہنانے کی سعادت صرف شوکت کے حصے میں آئی اور ان کے قلم سے اتنے خوب صورت پھول جھڑے جن کی تازگی اور رعنائی ابدالآباد تک قائم رہے گی۔ "بارِ خاطر" شوکت کا شاہ کار ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر وہ اس کو لکھنے کے بعد اپنا قلم توڑ دیتے تو بھی محض اس تصنیف کی بدولت ان کا نام زندہ رہتا۔ "بارِ خاطر" سے زیادہ کامیاب تحریف ابھی تک نہیں لکھی گئی اور نہ مستقبل قریب میں اس کے لکھے جانے کا امکان ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شوکت کے طنز و مزاح میں شائستگی یا گہرائی نہیں، انہیں چاہیے "بارِ خاطر" کا بار بار مطالعہ کریں۔

عموماً دیکھا گیا ہے کبھی کبھی ایک اچھا مضمون مصنف کے حق میں رحمت کی بجائے زحمت ثابت ہوتا ہے۔ اسی قسم کا سانحہ شوکت کے ساتھ بھی پیش آیا۔ انہوں نے ایک مضمون

بعنوان ''سودیشی ریل'' لکھااور ''سودیشی ریل'' والے شوکت کے لقب سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ اس مضمون کے بعد انہوں نے سینکڑوں کامیاب مضامین لکھے جنہیں بیشتر نقادوں نے اس بنا پر پڑھنے سے انکار کردیا کہ ''سودیشی ریل'' سے بھلا بہتر مضمون اب شوکت صاحب کیا لکھیں گے۔ ایمان کی تو یہ ہے کہ ''سودیشی ریل'' ان کی ابتدا تھی نہ کہ انتہا۔ میں ایسے نقادوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے ''سودیشی ریل'' بھی نہیں پڑھا لیکن جو اس امر کے باوجود یہ فتویٰ صادر کرنے کو تیار ہیں کہ شوکت کا مزاح سطحی ہے۔ تنقیدی سطحی پن کی اس سے بدتر مثال مشکل سے ملے گی۔

اور پھر وہ نقاد ہیں جو تنہائی میں شوکت کے مضامین مزے لے لے کر پڑھتے ہیں لیکن کھلے بندوں اس کی مذمت کرتے ہیں کیوں کہ ایسا کرنا فیشن میں داخل ہے۔ ان لوگوں پر یہ شعر صادق آتا ہے:

جنابِ شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا
مزہ بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوش گوار نہیں

شوکت صاحب تعریف و تنقیص سے بے نیاز تھے۔ میں نے انہیں کبھی کسی نقاد کی شکایت کرتے نہیں سنا۔ وہ جانتے تھے کہ سب سے بڑا نقاد وقت ہے اور اگر وہ ان کے مضامین پر سبحان اللہ کے ڈونگرے برسا رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آنے والی نسلیں انہیں فراموش کرسکیں گی۔ انہیں نہ کرم کی خواہش تھی نہ ستم کا شکوہ، فطرتاً وہ ظریف اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے اور انہیں خیال واقعہ یا کردار سے مزاح پیدا کرنے کے فن میں قابل رشک مہارت حاصل تھی۔ چوں کہ انہوں نے کسی مغربی ادیب کا تتبع نہیں کیا اس لیے ان کی ظرافت کے تیور سوفی صد مشرقی تھے۔ ان کے تمسخر کا طرۂ امتیاز دل جوئی تھا۔ دل شکنی نہیں، وہ نہ کسی ازم (ISM) سے تعلق رکھتے تھے اور نہ انہوں نے اپنے طنز و مزاح کو اصلاح و تربیت کا ذریعہ بنایا۔ ان کی زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے ہنسانا تھا۔ وہ مجسم ''اودھ پنچ'' تھے اور شاید اسی لیے ''اودھ پنچ'' کی شان میں کہا گیا اکبر الہ آبادی کا

قصیدہ مدحیہ شوکت کا بہترین مرثیہ ہے:

اے گوہرِ مخزنِ ظرافت
ے جوہرِ معدنِ لطافت
سرمایۂ انبساطِ خاطر
تسکینِ دل و نشاطِ خاطر
دیباچۂ دفترِ فصاحت
عنوانِ صحیفۂ بلاغت
رنگینی میں غیرتِ گلستاں
شوخی میں حریفِ برقِ تاباں
معقول مزاح ہے تو یہ ہے
شرعاً مباح ہے تو یہ ہے
ہے خلقِ خدا قتیل اس کی
حاسد کا حد دلیل اس کی
ہرکس کہ بدید گفت خوب است
باللہ مفرح القلوب است

OO